مولانا شمس تبریز خان

مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم
(مفکر، متکلّم اور مجتہد عالمِ دین)

ہر دور کی طرح عصر حاضر کے بھی کچھ مخصوص تقاضے اور مطالبے اور مشکلات و مسائل ہیں جن سے عہدہ برآ ہوئے بغیر نہ ہم عصر حاضر کے ساتھ چل سکتے ہیں نہ اسے اپنے ساتھ لے سکتے ہیں، نہ اسے قائل و معقول کرسکتے ہیں اور نہ اپنے اعتماد میں لے سکتے ہیں، نہ دین و مذہب کی صحیح خدمت انجام دے سکتے ہیں نہ انسانیت کی ہدایت و رہنمائی کا حق ادا کرسکتے ہیں۔

اس دور کے مسائل و مطالبات میں سرفہرست مسئلہ بغاوت عقل و خرد کے طوفانی و بحرانی ماحول میں مذہب واخلاق کی "قندیل رہبانی" یا "مینار روشنی" کی سلامتی و حفاظت ہے جس سے بے قید جمہوریت اور بے مہار جدیدیت و لادینیت کے زبردست جھکڑ اور تھپیڑے ٹکرا رہے ہیں ——— اس دور میں عقلیت و تجربیت کے ساتھ نظریۂ علمیت و افادیت بھی دین و اخلاق کے خلاف سرگرم ہے، روحانیت کے مقابلے پر مادیت اور مظاہر پسندی کو کہیں زیادہ فروغ حاصل ہو رہا ہے اور روایتی معیار و قدر سے سرکشی اور بغاوت کا ایک عام رجحان ہے جو سیلاب و طوفان کی طرح پوری زندگی کو متاثر کر رہا ہے، اس دور کے اور نمایاں رجحانات میں سائنس پر حد سے زیادہ اعتماد بھی ہے جس کی وجہ سے مذہب و اخلاق کو قصہ پارینہ سمجھ کر مذہبی و اخلاقی معیاروں کو سائنسی نقطہ نظر سے جانچنے کی لایعنی کوشش کی جاتی ہے۔ پھر سائنس نے جہاں انسان کی بہت سی مشکلیں آسان کی ہیں وہیں اس کے لئے دوسری مشکلات و مسائل بھی پیدا کر دیئے ہیں اور انسان کی "روشنی طبع" خود اس

سے لئے بلائے بے درماں بن گئی ہے اور اس سے وجود تک کو خطرہ لاحق ہے۔ سائنس کے غلط اور بے مقصد استعمال نے مہلک اور نازک اسلحوں کی دوڑ، بڑی طاقتوں میں رقابت وپنجہ آزمائی اور تیسری دنیا اور غیر جانبدار اور ترقی پذیر ممالک میں ان کی مہم جوئی وطالع آزمائی، اور کھلی جارحیت و مداخلت کے راستے ہموار کر دیئے ہیں۔ اور وحشت وبربریت کو فروغ دیا ہے۔ غرض سائنس کی مطلق العنانی نے امن انسانیت کو داؤں پر لگا دیا ہے اسی کے ساتھ انسانی مساوات، اقتصادی خوشحالی اور خود کفالتی، عورتوں کے حقوق کی ادائیگی وبحالی، ایک عالمی تہذیب وتمدن کی تشکیل وتعمیر، علوم وفنون کی کثرت میں رشتہ وحدت کی دریافت، اور علوم کا انسانی واخلاقی نقطۂ نظر سے انتخاب عالمی مذاہب اور تہذیبوں کا تقابلی مطالعہ اور تمام مسائل میں معروضی نقطہ نظر سے مسائل عصر جدید کے ذوق ورجحان کی نمایاں علامات ہیں۔

اسی طرح عالم اسلام اور ہندوستان میں جدت وقدامت کی کشمکش، اسلامیت اور مغربیت ومادیت کا تصادم، جمہوریت، اسلامی نظام اور بادشاہت وآمریت کی نزاع، راسخ الاعتقادی اور روشن خیالی کی آویزش، علماء اور تعلیم یافتہ طبقہ کے انداز فکر ونظر کا اختلاف، صنعت وسائنس، اور تعلیمی وثقافتی میدانوں میں مسلمانوں کی پسماندگی، بڑی طاقتوں کا استحصال واستعمار، اور اقلیتی حیثیت میں اپنی تہذیبی شناخت کی بقا وارتقاء وغیرہ وہ مسائل ہیں جن کو کوئی سنجیدہ مفکر ومصلح اور کوئی صاحب فکر ونظر عالم وداعی دین نظر انداز نہیں کر سکتا اور سے اپنے ذوق وظرف کے مطابق عہدہ برآ ہوئے بغیر عصر حاضر میں مذہب وانسانیت کی کوئی وقیع خدمت نہیں دے سکتا ہے۔

ہندوستان میں دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ممتاز فرزندوں نے مذکورہ دینی وانسانی فرائض کی تکمیل وتعمیل میں نمایاں حصہ لیا ہے جن میں مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم ایک نمایاں اور منفرد مقام پر فائز ہیں۔ کیونکہ عصر حاضر میں اسلام کی اہمیت وافادیت، جدید ذوق وذہن کے لئے قابل قبول انداز میں اسلام کی ترجمانی لامذہبیت کے عالم گیر طوفان میں مذہب واخلاق کا تحفظ، بحث ونظر میں معروضی اور خالص علمی وتحقیقی انداز فکر پر زور، ہندوستان کے ملی مسائل کی بے باک ترجمانی اور ولی اللّٰہی فکر اور اکابر علمائے دیوبند کے علوم وافکار کی روشنی میں مسائل پر بحث وتحقیق مولانا اکبرآبادی کے فکری سرمائے کے گرانقدر عناصر تھے۔

عصر حاضر کے زندہ وتازہ موضوعات ومسائل اور اپنے زمانے کے انھیں مباحث پر انھوں نے قلم اٹھایا جو دین وانسانیت کے لئے بہت ہی کارآمد ومفید اور لازمی وضروری تھے۔ ان کے افکار وخیالات،

توازن واعتدال، ایماندارانہ تحلیل وتجزیہ، غیر جانبدارانہ اور بے لاگ نقطہ نظر کے نادر و کمیاب نمونے ہیں، تصانیف کے علاوہ تقریباً نصف صدی پر پھیلے ہوئے ان کے علمی وفکری کارنامے ماہنامہ برہان (دہلی) کے اداریے ان کے تبصرے اور جائزے، صاف بیانی وصاف باطنی، اخلاقی جرأت، حاضر دماغی و بیدار مغزی، دوربینی و دقیقہ رسی کے دلکش نمونے ہوتے تھے، اس خصوصیت میں معدودے چند علماء کے سوا ان کے بہت کم شریک وسہیم نظر آئیں گے، بلکہ طبقہ علماء میں بھی وہ ایک منفرد اور مخصوص مقام پر فائز نظر آتے ہیں، ان کی ذہنی تشکیل اور فکری تعمیر میں جدید وقدیم مشرق ومغرب، اسلامیت وعصریت، اور جدت و روایت کے خوشگوار اجتماع اور مناسب امتزاج نے بڑا تنوع اور بڑی جاذبیت پیدا کردی تھی۔

قدیم تعلیم میں ان کی لیاقت و مہارت کا پس منظر یہ تھا کہ انھوں نے دارالعلوم دیوبند میں وقت کے چیدہ اور جید علماء واساتذہ علامہ انور شاہ کشمیریؒ، شبیر احمد عثمانیؒ مفتی عزیز الرحمن عثمانی اور علامہ ابراہیم بلیاوی سے استفادہ کیا اور علامہ کشمیری کی خصوصی تربیت میں رہے اور پوری یکسوئی وانہماک سے فراغت علمی حاصل کی، مولانا انور شاہ اور مولانا عثمانی ہی کے زیر اثر فرق باطلہ اور دیگر مذاہب کے تقابلی مطالعہ کی طرف توجہ کی۔

۱۹۲۵ء میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد دہلی کے سینٹ اسٹیفن کالج سے گریجویشن اور پھر عربی میں امتیاز کے ساتھ ایم۔ اے کیا اس کے ساتھ ذاتی محنت وصلاحیت کے سبب انگریزی میں تقریر و تحریر کی اعلا استعداد پیدا کرلی، انگریزی میں ان کے متعدد علمی مقالات بلند پایہ رسائل میں شائع ہوئے، ملک وبیرون ملک کے اہم سیمناروں میں انگریزی مقالات تحریر کئے۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ دینیات کی صدارت سے سبکدوش ہونے کے بعد حکیم عبدالحمید صاحب کے "انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز" کے لئے قانون ابن سینا کا انگریزی ترجمہ کر رہے تھے جو نامکمل رہ گیا، میکگل (کناڈا) کے "اسلامک انسٹی ٹیوٹ" میں استاذ زائر کی حیثیت سے متعدد تقریری وتحریری لکچر انگریزی میں پیش کئے اور مستشرقین یورپ وامریکا سے بھی داد وصول کی، انگریزی کی لیاقت ہی کی بدولت انھوں نے اسلام پر مستشرقین کے "اعتراضات" کو سمجھا اور ان کا ترکی بہ ترکی جواب دیا، وہ مستشرقین کی محنت وریاضت کے منکر نہ تھے اور ان پر محض تنقید کے بجائے مثبت طور پر ان کے رد وجواب میں یقین رکھتے تھے، اسی کے ساتھ ان کا دعوتی اور بلند پایہ علمی مذاق اور عصری رجحانات سے ان

کی واقفیت، غیر مسلم حلقوں میں ان کو دعوت وتبلیغ کے مواقع فراہم کر دیتی تھی،، وہ اپنی ہمت ولیاقت اور توفیق الٰہی سے ایسے اجنبی ماحول میں بھی پہنچ سکتے تھے جہاں ہمارے علماء اور اہل دعوت کم پہنچ پاتے ہیں اسی خداداد اہلیت کی بنا پر انھوں نے مغربی تہذیب کو اس کے مرکزوں روس اور امریکا، ایشیا اور یورپ میں پہنچ کر چیلنج کیا، مستشرقین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اور پورے اعتماد کے ساتھ گفتگو کی، اور انگریزی محاورے کے مطابق مغرب سے مطالبے کو اسی کے سکوں اور اسی کی اصطلاحوں میں ادا کر دیا۔

ان کے ذہن وفکر اور طرز اسلوب کی نمایاں خصوصیت وانفرادیت، ان کی تحقیق، استدلالی اور اجتہادی دکلامی رنگ تھا جس سے ان کی تحریریں شروع سے مزین رہی ہیں، وہ اجتہادی صلاحیتوں اور اس کی بہت سی شرطوں کے حامل تھے اور دبستان دیوبند کے مجتہد علماء کے اجتہادی ذوق سے انھوں نے خصوصی فائدہ اٹھایا اور ان کے چراغوں سے اپنا چراغ فکر روشن کیا تھا، وہ عصر حاضر کی مشکلات ومسائل، مطالبات ومقتضیات سے پوری طرح واقف اور زمانہ کی تبدیلیوں اور رویوں سے بخوبی آشنا تھے اس لئے پیش آمدہ مسائل کے ہر پہلو پر بحث کر کے کتاب وسنت اور علمائے امت کی تحقیق کی روشنی میں اپنی رائے اور اپنا حل پیش کرتے وہ کبھی کبھی رائے عامہ سے جزوی اختلاف کر کے دین کی رُوح اور شریعت کے مزاج کو دیکھتے ہوئے اور اس کی بخشی ہوئی گنجائشوں اور آسانیوں سے کام لے کر مسائل کا عملی حل پیش کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

ہندوستان کے دارالحرب اور دارالامن ہونے کی بحث انگریزوں کے اقتدار کے بعد حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے فتوی سے شروع ہو گئی تھی، انھوں نے اس بحث کے تمام اطراف کا احاطہ کرتے ہوئے اس کے نازک اور باریک پہلوؤں پر بھی لوگوں کو متوجہ کیا اور استصلاح ومصالح مرسلہ سے کام لیتے ہوئے قول فیصل کہنے کی کوشش کی جس کی رُوح یہ تھی کہ ہندوستان جیسی سیاسی صورتحال پہلے شاید کہیں اور کبھی نہیں رہی اس لئے اس بارے میں فیصلہ کرتے ہوئے اس کی نئی اور انوکھی صورتحال کو سامنے رکھنا ضروری ہے اور دارالحرب ودارالاسلام کے احکام کے درمیان نئے "دار" اور نئے قسم کے ممالک کی گنجائش بھی رکھی جائے گی اور ان کے لئے کوئی درمیانی حکم ہوگا۔ ان کی یہ بحث پہلے برہان میں شائع ہوئی۔ پھر مسلم یونیورسٹی پبلی کیشنز سے نفثۃ المصدور اور ہندوستان کی شرعی حیثیت کے نام سے شائع ہوئی۔

یہاں یہ غلط فہمی نہ ہو کہ انھیں بعض معاصر اہل علم کی طرح اجتہاد کا شوق تھا اور وہ خواہ مخواہ اپنے علم

واجتہاد کی نمائش کرکے اور علمائے متقدمین و متاخرین کی آراء سے الگ رائے قائم کرکے اپنی انفرادیت کا اعلان پسند کرتے تھے بلکہ اس کے برعکس وہ حتی الامکان سلف اور جمہور امت سے وابستگی ہی کی کوشش کرتے، اور اسی کو صحیح طریقہ سمجھتے تھے، ان کے اجتہادی آراء میں عصری علوم و فنون اور سائنس اور ٹکنالوجی کے مظاہرے سے مرعوبیت یا نئے زمانے کی جا و بیجا حمایت کارفرما نہیں ہوتی تھی بلکہ ان کی بنیاد نصوص اور روایات سلف ہوتی تھیں اور ان کی رخصت و گنجائش کے مطابق ہی وہ اپنی رائے پیش کرتے تھے اور اس پر انھیں نار وا اصرار نہیں ہوتا تھا بلکہ اپنی طرح دوسروں کو بھی اختلاف اور اظہار خیال کا حق دیتے تھے اور نئے مسائل پر وہ اپنے چھوٹوں سے بھی آرا دانہ تبادلہ خیال پسند کرتے تھے، وہ اسلاف واکابر دیوبند کے تحقیقی واجتہادی مسلک پر برابر قائم رہے اور اس مکتب فکر و خیال کے علمی و روحانی سرچشمے سے فیضان حاصل کرتے رہے۔

تقسیم ہند کے موقع پر بھی وہ مسلمانوں کو ان کا دعوتی منصب و مقام یاد دلاتے رہے اور ان کو اسلام کے اصول و احکام کی پابندی کی دعوت دیتے رہے اور اس مسئلے میں قوم پرور اور محب وطن علماء کے مسلک و موقف سے متفق رہے اور اپنی اصول پسندی کی قیمت اس طرح چکائی کہ دہلی کے فسادات میں ندوۃ المصنفین کے سارے اثاثہ کی بربادی و تاراجی کا جاں گداز صدمہ بڑے مومنانہ صبر و ضبط کے ساتھ برداشت کیا اور اس کی از سر نو بحالی کی مشقت بھی اٹھائی۔ پھر تقسیم ہند کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی بحالی و ثابت قدمی اور ان کی ہمہ جہتی رہنمائی کا فرض بھی اپنے علم و فہم کی روشنی میں ادا کرتے رہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کی فکری و سیاسی رہنمائی کا فرض انھوں نے بڑی حکمت اور ذہانت سے انجام دیا، اور انتہاپسندی اور جلد بازی کے بجائے اعتدال و میانہ روی اور دوراندیشی اور دوررسی کا راستہ دکھایا، اس کی ایک بڑی مثال ان کا وہ طویل سلسلہ مضامین ہے جو انھوں نے "مسلم یونیورسٹی علی گڑھ" کی تحریک کے ماضی و حال کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا تھا اور برہان کی ۱۵-۲۰ قسطوں میں شائع ہوا تھا۔ اس سے مولانا کا ملی و سیاسی نقطۂ نظر بہت واضح طور پر سامنے آتا ہے جس میں ان کی معاملہ فہمی و مردم شناسی نئے حالات سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت، درد ملت اور قومی غیرت اور اجتہادی فکر و نظر اور اصابت رائے پوری طرح نمایاں ہے یہاں بہ نظر اختصار ان کی تحریر کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے جو انھوں نے "علی گڑھ" پر لکھی تھی، جس

---

۵۱ اس سلسلے میں ۱۹۴۷ء کے برہان میں ان کے "نظرات" اور مضامین دیکھے جاسکتے ہیں خصوصاً "ہندوستان کے فسادات اور مسلمان"

سے ان کے اجتہاد پسند ذوق و مزاج کا کچھ اندازہ ہوتا ہے، لکھتے ہیں:۔

"اگر قدرت کو اس قوم کو زندہ رکھنا منظور ہوتا ہے تو اس عالم اضطراب و کشمکش میں آخر کچھ لوگ پردۂ ظہور پر آتے ہیں، یہ روشن خیال اور بالغ نظر ہوتے ہیں، ان کو ایک جانب اپنے ماضی کی تابناکی اور قومی و ملی انفرادیت کا یقین ہوتا ہے اور دوسری جانب وقت کی ہواؤں کا رخ پہچان لینے کا ان میں سلیقہ ہوتا ہے، وہ زمانے کے ہاتھ کی لکیروں کو پکڑ سکتے ہیں اور انقلاب روزگار کی صداؤں کو سن سکتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ اب نہ مقاومت مجہول سے کچھ فائدہ ہو گا اور نہ عزلت گزینی و فراریت کی راہ اختیار کرنے سے کام بنے گا، اب وقت جدوجہد اور سعی و عمل کا ہے جو وقت کے دھارے کا رخ اس طرح موڑ دے کہ وہ ہلاکت کے بجائے ان کی سلامتی کا سبب بن جائے اور یہ کام مصالحت و مطابقت کے ذریعے ہی سرانجام ہو سکتا ہے یہ لوگ تمسک و تردد اور حیص بیص کا لبادہ اتار کر، عزم و ہمت اور پامردی اور استقلال کے ساتھ اپنی کشتی لے کر سیلاب میں کود پڑتے ہیں اور کہتے ہیں:

"ہرچہ بادا باد ماکشتی بہ آب انداختیم"[له]

بنگلور جنوبی ہند کی ایک کانفرنس کی روداد میں لکھتے ہیں:۔

"میں نے مسلم معاشرے میں پائے جانے والے رجحانات کا ذکر کیا، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ رجحانات تین قسم کے ہوتے ہیں، قدامت پرستی، ترقی پسندی اور آزاد فکری، اول الذکر کی خصوصیت یہ ہے کہ موجودہ زمانے کا قواہ کوئی مسئلہ یا کوئی معاملہ ہو بہرحال اس کا حل کسی ایک خاص فقہی مسلک کی روشنی ہی میں تلاش کیا جائے اور سرمو اس سے انحراف روانہ رکھا جائے، اس کے بالمقابل ترقی پسندی کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اصل قانون قرآن و حدیث میں ہے اور فقہی مسالک کی حیثیت اس قانون کی تشریح و توضیح کی ہے وہ بجائے خود قانون نہیں ہے اس بنا پر کسی جدید مسئلے کا حل اولاً براہ راست قرآن و حدیث میں دیکھنا چاہیئے اور اس کے بعد فقہ سے وہی کام لینا چاہیئے جو عدالت میں بحث کرتے وقت ایک وکیل نظائر سے لیتا ہے۔ اب رہا تیسرا

له برہان، اگست ۱۹۷۳ء

رجحان، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ صرف قرآن کو ماخذ تسلیم کرتا ہے اور حدیث کو حجت نہیں مانتا پھر اپنے لئے قرآن کی آزاد اور بے قید و بند تفسیر و توضیح کا حق بھی مانتا ہے میں نے لکھا کہ میرا تعلق دوسرے طبقے سے ہے اور یہی رجحان میرے نزدیک صحیح ہے'' لہ

ان کی شخصیت کو فضل و کمال کی وسعت و تنوع، جامعیت و ہمہ گیری، ذہنی افق کی بلندی و عالی ظرفی، کشادہ قلبی اور وسیع النظری، مختلف زبانوں اور ثقافتوں سے استفادہ، عالمانہ وقت نظر، مفکرانہ غور و فکر، داعیانہ جذبہ خلوص اور ادیبانہ رنگا رنگی، اور شگفتگی کے اجتماع نے ہشت پہل اور کثیر الجہات بنادیا تھا ان گوناگوں خصوصیات کے ساتھ ان کے اندر مسلمانوں کی صفوں کی وحدت و اجتماعیت، اور ان کے اندر زیادہ سے زیادہ اتحاد اور اتفاق پیدا کرنے کا شدید داعیہ و جذبہ بھی تھا۔ جس کی وجہ سے وہ مسلمانوں کے ہر حلقے اور ادارے میں مقبول تھے ندوۃ العلماء کی طرح جامعہ ملیہ اسلامیہ، اور مسلم یونیورسٹی میں بھی یکساں طور پر ان کا استقبال و خیر مقدم ہوتا تھا، مولانا آزاد کے مشورے سے وہ مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل رہے اور پھر ڈاکٹر ذاکر حسین خاں اور کرنل بشیر حسین زیدی کے اصرار پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ آئے، ندوۃ العلماء سے وہ شروع سے وابستہ رہے مولانا شبلی و مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا سید ابوالحسن ندوی مدظلہ سے انھیں بڑی ذہنی و فکری مناسبت رہی اور ان کی علمی و ملی خدمات کے قدرداں رہے، دوسری طرف مولانا سید سلیمان ندوی نے مولانا انور شاہ کشمیری کی وفات پر اپنے مضمون میں مولانا اکبرآبادی اور مولانا کے دیگر ممتاز تلامذہ کو ''مستقل دائرہ علم'' قرار دیا، مولانا سید ابوالحسن علی مدظلہ انھیں ندوۃ کے جلسوں میں برابر مدعو کرتے اور ان سے طلبہ و اساتذہ کو خطاب کرنے کی فرمائش کرتے تھے، وفات سے چند ماہ پہلے مولانا مدظلہ کی دعوت پر مولانا اکبرآبادی نے طلبائے ندوۃ کی ''انجمن الاصلاح'' میں اسلامی اخلاق پر ایک فاضلانہ و حکیمانہ تقریر کی اس موقع پر مولانا علی میاں صاحب نے طلبہ کو متوجہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ''مولانا اکبرآبادی کے علم و فضل کے پیش نظر کل آپ دوسروں سے فخر کے طور پر کہہ سکیں گے کہ آپ نے انھیں دیکھا تھا'' ان کی وفات پر مولانا مدظلہ نے انھیں بڑے بلند الفاظ میں یاد کیا۔ ٹہ

لہ برہان، اکتوبر ۱۹۶۲ء

ٹہ مولانا کی تقریر 'تعمیر حیات' لکھنؤ ۱-۲۵ جولائی ۱۹۸۵ء کے شمارے میں شائع ہوئی۔

حسن تقریر وتحریر ان کی دستارِ فضل وکمال کا طرۂ امتیاز تھا، ان کی تقریر ایک مدلل خطبہ ومقالہ کی حیثیت رکھتی تھی جس میں وہ موضوع کی اہمیت اور سامعین کے مذاق کا پورا خیال کرتے تھے اور اپنی بات بڑی اعتماد، وضاحت اور منطقی ترتیب سے کہتے تھے جس کی وجہ سے وہ ذہن نشین ہونے کے ساتھ دل نشین بھی ہو جاتی تھی، ان کا لہجہ بڑا دلکش، آواز صاف، شیریں اور بلند تھی اور عربی الفاظ کو صحیح مخارج سے ادا کرتے تھے۔

ان کی تقریر کی طرح ان کی گفتگو بھی بڑی دلچسپ شگفتہ اور علمی ہوتی تھی اور حالاتِ حاضرہ سے زیادہ علمی نکات، فقہی تحقیقات اور دینی افادات پر مشتمل ہوتی تھی اور حسنِ گفتار کے باعث گویا منھ سے پھول جھڑتے اور موتی بکھرتے تھے۔

علمی و عملی کمالات کے ساتھ انسانی و اخلاقی حیثیت سے بھی ان کی شخصیت معیاری کہی جاسکتی تھی، بایں جلالتِ علمی و دینی، الگ تھلگ اور لئے دیئے رہنے کے بجائے اپنے ہم مذاق معاصروں اور چھوٹوں سے بھی قدرے بے تکلف رہتے اور مزاح وظرافت سے بھی کام لیتے تھے، شرافت وانسانیت، حسن اخلاق ومروت، کی وجہ سے ہر جگہ اور ہر حلقے میں اس طرح مقبول ومحبوب رہے کہ شاید ہی کسی کو ان سے شکایت ہوئی ہو، اس کے ساتھ ان کی حق گوئی اور صاف بیانی بہت نمایاں تھی اور اس میں اخلاص وخیر خواہی کے ساتھ اور بے لاگ انداز میں اظہار خیال کر دیتے تھے اور بے جا مروت و رعایت کے قائل نہ تھے۔

رسالہ برہان کے 'نظرات' اور تبصروں میں اور شخصیات و افکار کی تنقید کے سلسلے میں انھیں برابر اظہار خیال کرنا ہوتا تھا مگر ان کا خلوص، حق پسندی علم وتحقیق اور شائستہ و شریفانہ لہجہ ان کی تنقید کو تنقیص وتضحیک اور بدمزگی سے بچا لیتا تھا، اپنی اس افتادِ طبع کے بارے میں انھیں خود احساس تھا، انھوں نے برہان میں ایک بار لکھا تھا

> "برہان کی موافقت یا مخالفت مسئلہ زیر بحث سے صرف علمی تجزیہ پر مبنی ہوتی ہے اور سنجیدہ ومتین لب ولہجہ میں ہوتی ہے جس میں نہ مدح سرائی ہوتی ہے اور نہ دل آزاری کی آمیزش! یہی وجہ ہے کہ گذشتہ چند برسوں میں ایڈیٹر برہان کے قلم سے جو بعض تنقیدی مضامین نکلے ہیں ان کو پڑھ کر وہ حضرات جن پر تنقید کی گئی تھی نہ صرف یہ کہ بددل اور بدمزہ نہیں ہوئے بلکہ انھوں نے بھی دعائیں دی ہیں اور شکریے کے خطوط لکھے ہیں۔ جو بات ایمانداری اور علمی دیانت کے ساتھ کہی جاتی ہے وہ اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہتی اور اس کے برخلاف جس اختلاف خیال کا اظہار معاندانہ طریقہ پر ہوتا ہے اس سے بجائے نفع کے ہمیشہ نقصان ہی پہنچتا ہے اور اصل مقصد حاصل

نہیں ہوتا۔[۱]

خود داری اور وضع داری، ضبط و تحمل، اور ایثار و اخلاق کی ایک خاص شان رکھتے تھے اور حتی الامکان اس میں فرق نہیں آنے دیتے تھے، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے سبکدوش ہونے کے بعد ان کی مالی حالت اچھی نہیں تھی اور ان پر گھریلو بار بھی بہت بڑھا ہوا تھا، اولاد کے مستقبل کی طرف سے بھی اطمینان نہ تھا اور مجموعی طور پر ان کو بے اطمینانی سے سابقہ تھا مگر گفتگو اور تحریر میں کبھی کوئی حرف شکایت سننے یا دیکھنے میں نہیں آیا اور انھوں نے اپنے آخری ایام بڑے مومنانہ صبر و ثبات سے بسر کیئے، پہلے اہلیہ محترمہ کا انتقال ہوا، پھر جوان صاحبزادے نے داغ فراق دیا۔ سنگ گزیدگی اور یرقان کا شکار ہوئے مگر ان حالات میں شیخ الہند اکیڈمی اور دارالعلوم دیوبند کی ترقیاتی اسکیموں میں دلچسپی برقرار رکھی، علمی مجلسوں میں شریک ہوتے رہے اور تحریری و تصنیفی سرگرمیاں بہر حال جاری رہیں اور یہ عزیمت صدیق اکبرؓ اور عثمان ذوالنورینؓ کے سیرت نگار شایان شان بھی تھی۔

دارالعلوم دیوبند کے اختلاف کے دوران بھی ان کی ان خصوصیات کا ان کے اخلاقی جرأت، عزیمت و استقامت، فہم و فراست، اصلاح ذات البین کا جذبہ اور اس دینی و ملی ادارے کی خدمت اور اس کے ایثار و قربانی کے قابل تقلید نمونے دیکھنے میں آئے[۲] پیرانہ سالی اور شکستہ دلی کے ان ایام میں انھوں نے گوشہ عافیت اختیار کرنے کے بجائے دینی و ملی سرگرمیوں میں اپنی دلچسپی قائم رکھی اور اپنی صلاحیت اور باقی ماندہ قوت قومی و اجتماعی کاموں کے لئے وقف کر دی، دارالعلوم کے مجروح شدہ وقار کی بحالی کے لئے انھوں نے اپنی شخصیت کا پورا وزن اس کے پلڑے میں ڈال دیا اور فریق ثانی کی خدمات کے اعتراف اور ان سے دیرینہ تعلقات کے باوجود انھوں نے اصولی کوشش جاری رکھی اور بالآخر اپنے رفقائے شوریٰ کے ساتھ دارالعلوم دیوبند کی کشتی کو منجدھار سے نکالنے میں کامیاب ہو گئے اور پھر اس پیر جواں ہمت نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کے نام پر ایک علمی اکیڈمی کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا لیا اور دارالعلوم کی تقویت کے لئے مختلف ممالک کے سفر کی صعوبت بھی اٹھائی

جہاں تک میری ان سے ذاتی نیاز مندی کا تعلق ہے اس کی مختصر روداد یہ ہے کہ سب سے پہلے ان کے نام سے اس وقت واقف ہوا جب ۱۹۵۵ء میں شعور کی آنکھیں کھلیں اور ماہنامہ برہان کی فائلوں سے مطالعے کا موقع

---

۱ برہان ستمبر ۱۹۵۷ء

۲ مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مولانا منظور نعمانی صاحب کا تعزیتی مضمون الفرقان جون جولائی ۱۹۸۵ء

ملا، پھر دارالعلوم دیوبند کی طالب علمی کے زمانے میں غالباً جب وہ ۱۹۶۱ء میں رکن شوریٰ ہو کر دارالعلوم تشریف لانے لگے تو دارالحدیث تحتانی میں طلبہ کے ساتھ ان کی فاضلانہ تقریریں سننے کے مواقع ملتے رہے ۔

متعدد بار علی گڑھ میں ان کی قیام گاہ پہ ملنے اور ان کی ضیافت سے بھی بہرہ یاب ہونے کا اتفاق بھی ہوا، ندوۃ العلماء کی شوریٰ کے رکن ہو کر جب یہاں آنے لگے تو تفصیلی ملاقاتیں ہوتی رہیں وہ بڑے تپاک سے ملتے اور حالات دریافت کرتے، ایک بار میری کتابوں کی تعداد معلوم کر کے کہنے لگے کہ "آپ کو تو انعام ملنا چاہئے" پھر دارالعلوم دیوبند کے بحران میں جب رسالہ دارالعلوم کی ادارت کے لئے کسی مناسب آدمی کی جستجو ہوئی تو غالباً مولانا اکبرآبادی ہی نے میرا نام شوریٰ میں تجویز کیا اور میری رضامندی سے بعد وہ بہت خوش تھے، اور ارکان شوریٰ سے بحیثیت مدیر میرا تعارف کرایا اور عزت افزائی فرمائی، پھر جب میں بعض وجوہ سے ادارت قبول نہ کرسکا تو "شیخ الہند اکیڈمی" دیوبند کی رفاقت کے لئے کوشاں ہوئے اور بہت اصرار فرمایا! وہ کہنے لگے کہ میں کوئی اچھا سا مکان لے لوں گا جس میں آپ بھی رہیں گے، شیخ الہند اکیڈمی کے لئے انھوں نے بڑی اولوالعزمی سے ساتھ منصوبے بنا رکھے تھے فرماتے کہ حجۃ اللہ البالغہ اور اکابر دیوبند کی تصانیف کو ایڈیٹنگ کے جدید لوازم کے ساتھ شائع کیا جائے گا اور اس طرح ایک مثالی اکیڈمی وجود میں آئے گی، اکیڈمی کے ترجمان کی طور پر بڑے آب و تاب کے ساتھ ایک سہ ماہی مجلہ الدراسات الاسلامیہ بھی نکالنا شروع کیا تھا اور بعض رفقاء سے عربی کتابیں بھی لکھوا رہے تھے اگر ان کو کچھ اور موقع ملا ہوتا تو دارالعلوم کے ساتھ "شیخ الہند اکیڈمی" کو مضبوط بنیادوں پر قائم کر دیتے۔ اب کارکنان دارالعلوم کا یہ فرض ہے کہ اس اکیڈمی کو حضرت شیخ الہند اور مولانا اکبرآبادی کی یادگار کے طور ان کے شایان شان ترقی دیں جس سے دارالعلوم کے وقار میں اضافہ ہوگا اور جو عصر حاضر کا ایک یادگار تقاضا ہے ۔

ان کی خردنوازی خلوص وخیرخواہی پر مبنی ہوتی تھی۔ اور اس میں بھی بے جا رعایت و مروت سے کام نہیں لیتے تھے بہت دنوں کی بات ہے کہ ایک بار میں نے حضرت شاہ ولی اللہ کی حجۃ اللہ البالغہ اور ازالۃ الخفا کا حاصل مطالعہ کچھ تمہیدات کے ساتھ انھیں برہان میں اشاعت کے لئے بھیج دیا جسے انھوں نے مجھے واپس کرتے ہوئے لکھا کہ آپ نے کلاس نوٹس تیار کئے ہیں جو مزید وضاحت اور محنت کے طالب ہیں، اور ان کی اشاعت پر عجلت مناسب نہیں، اسی طرح مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ کے لئے میں نے متوفی یوسف چلپی کی کتاب أضواء علی المسیحیۃ کا اردو ترجمہ کیا اور انھیں مقدمہ لکھنے کے لئے بھیجا تو انھوں

نے اسے واپس کرتے ہوئے لکھا کہ آپ کو اور زیادہ علمی و تحقیقی کاموں میں لگنا چاہیئے۔ ان واقعات سے ان کے بلند پایہ علمی ذوق کے ساتھ اپنے چھوٹوں کی اصلاح و خیر خواہی کے جذبہ کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔

ان کی اعلیٰ علمی لیاقت، عالی دماغی و بلند ہمتی، صحت ذوق و حسن طبیعت مجسم ہو کر برہان اور ندوۃ المصنفین (دہلی) کی شکل میں ظاہر ہوئے تھے ۱۹۳۸ء میں یہ ادارہ انھوں نے مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی مرحوم مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم کی رفاقت میں قائم کیا تھا اور اسی سال جولائی سے رسالہ برہان جاری کیا جو سرد و گرم حالات کے باوجود بلا ناغہ نکلتا رہا اور ماشاء اللہ اب بھی نکل رہا ہے، ندوۃ المصنفین، کی یہ خصوصیت حیرت انگیز ہے کہ وہ مستقل رفقاء کی غیر موجودگی میں بھی دار المصنفین (اعظم گڑھ) کی طرح علمی کاموں میں سرگرم رہا ہے اور متنوع علمی و دینی موضوعات پر عصری ذہن کو سامنے رکھتے ہوئے مفید و قیمتی لٹریچر تیار کرتا رہا ہے، برہان و معارف ہماری علمی زندگی میں چراغ راہ اور نشان منزل کی حیثیت رکھتے ہیں اور بجائے خود ملت اسلامیہ ہند کی علمی تاریخ بھی ہے اور انھوں نے علم و ادب اور فکر و نظر کی تاریخ بھی بنائی ہے ان کی اسی اہمیت کے پیش نظر جناب عابد رضا بیدار (ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری پٹنہ) نے برہان میں علوم اسلامیہ کی ایک انسائکلوپیڈیا کے عنوان سے ان رسالوں کے مضامین کا ایک تفصیلی اشاریہ شائع کیا تھا۔ ان کے آخری حالات مختصر طور پر ان کے لائق و فاضل داماد پروفیسر محمد اسلم صاحب (صدر شعبۂ تاریخ، پنجاب یونیورسٹی لاہور) نے مختلف اخبارات و رسائل شائع کرا دیے ہیں، (اب ضرورت ہے کہ وہ مولانا مرحوم کی سوانح حیات بھی لکھدیں) ان حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا مرحوم کے آخری حالات بھی بہت قابل رشک تھے، وہ لکھتے ہیں:

"میں وسط اپریل میں کراچی گیا اور چھ روز تک ان کے ساتھ رہا، کمزوری بہت زیادہ ہو گئی تھی اور ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گئے تھے، اس عالم میں نماز کھڑے ہو کر پڑھتے اور جمع صلوٰۃ کرتے، مجھ سے کہنے لگے کہ امام ابن تیمیہؒ کا فتویٰ ہے کہ مریض جمع صلوٰۃ کر سکتا ہے"۔ [1]

اسلم صاحب نے لکھا ہے کہ وہ آخری ایام میں اکثر یہ شعر بہت درد و سوز کے ساتھ پڑھتے رہتے تھے جس سے ان کی باطنی کیفیات کا کچھ اندازہ ہوتا ہے ؎

یارب تو کریمی و رسول تو کریم
صد شکر کہ ہستم میان دو کریم

[1] تعمیر حیات، لکھنؤ، ۱۰-۲۵ جولائی ۱۹۸۵ء

باقی صفحہ ۲۲ پر